(بسلسلۂ دعوتِ اصلاح و تبلیغ)

اسلام اور موجودہ مسلمان قوم

اس مختصر مقالہ میں بتلایا گیا ہی کہ اصلی اسلام کیا ہے
اور موجودہ مسلمان قوم اُس سے کس قدر دُور اور کتنی خالی ہی
اور موجودہ مسلمانوں میں اصلی اسلامی زندگی پھر سے
پیدا کرنے کی کوشش کن اصولوں پر ہو سکتی ہی۔

از

محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ

مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور موجودہ مسلمان قوم

اسلام سے معمولی واقفیت رکھنے والے بھی سب جانتے ہیں کہ اسلام اُس طریقۂ زندگی اور اس طرزِ حیات کا نام ہے جس کو لیکر انبیاء علیہم السلام آئے اور جس کے متعلق اللہ کی طرف سے آنے والے ان سب پیغمبروں نے اپنے اپنے وقت کے انسانوں کو بتلایا کہ تمھارے خالق و مالک اور تمھارے رب نے تمھارے واسطے زندگی کا یہی طریقہ مقرر کیا ہے - اس پر چلنے ہی میں تمھاری فلاح اور نجات کا انحصار ہے، اور اس پر نہ چلنے میں تمھاری ابدی ہلاکت و بربادی ہے —— سب سے آخر میں ہمارے رسول کریم (علیہ التحیۃ والتسلیم) بھی اسی دین اور اسی طریقۂ زندگی کو آخری مکمل شکل میں لیکر آئے قرآن مجید آپ کے لائے ہوئے اس دینِ حق کا جامع متن اور اساسی دستور ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت (رض) کا طرزِ عمل اس کی عملی تفسیر اور قیامت تک کیلئے اس کا معیاری اور مثالی نمونہ ہے

اب موجودہ مسلمان قوم کے دینی انحطاط و تنزل بلکہ اصلی اسلام سے اسکی دوری و محرومی کا اندازہ کرنے اور ان کی دینی اصلاح اور ان میں دعوتِ دینی کے احیاء کی ضرورت کا واجبی احساس کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرنِ اوّل کے صحیح اسلام اور اسکے صحیح نمونوں کو سامنے رکھ کر ہم موجودہ مسلمان قوم کی دینی حالت کا جائزہ لیں -

عہدِ نبوت کے مسلمانوں کا عام دینی حال

عہد نبوی کے حاملانِ اسلام یعنی صحابۂ کرامؓ یوں تو سارے کے سارے
اسلامی اوصاف و کمالات کے حامل اور ظاہراً و باطناً کامل تھے لیکن یہاں ہم ان کے صرف چند اہم
اور بنیادی اسلامی اوصاف کو لیتے ہیں اور انہی کے لحاظ سے موجودہ مسلمان قوم کا جائزہ لینا چاہتے ہیں

(۱) حقیقی اور شعوری اسلام کا عموم

عہد نبوی میں جن لوگوں نے دعوتِ اسلام کو قبول
کیا تھا اور جو اُس وقت جماعتِ مسلمین میں داخل
ہوئے تھے وہ سب کے سب بلا استثناء ایمان اور اسلام کی حقیقت اور اسکے تقاضوں کو جانتے تھے، وہ
خوب سمجھتے تھے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہہ کر ہم نے کس چیز کا انکار اور کس چیز کا اقرار کیا ہے، اور اس
انکار و اقرار کا مطالبہ ہم سے کیا ہے، اور محمدٌ رسول اللہ کہہ کر ہم نے اپنے آپ کو کسی کی مطلق پیروی
اور فرمانبرداری کا کیسا پابند کر دیا ہے، اور اس کلمہ کا ہماری زندگی پر کیا اثر پڑنا چاہیے ۔ اسی کا
نتیجہ تھا کہ جو شخص بھی جس دن اسلام کی دعوت قبول کر کے مسلمانوں میں شامل ہوتا تھا اسی دن سے اسکی
پوری زندگی کا رُخ بدلنے لگتا تھا وہ محسوس کرنے لگتا تھا کہ جب میں صرف خدا ہی کا بندہ ہوں اور
وہی میرا مالک و مولا ہے تو مجھے اس کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے اسکی بندگی اور اسکی کامل اطاعت
کرنی چاہیے اور محمدؐ جو اسکے سچے رسول اور اسکی طرف سے احکام لانے والے اور اسکی مرضی کے نمائندہ ہیں
ان کے حکموں کی مجھے پوری پوری پیروی کرنی چاہیے ۔ وہ یقین کرتا تھا کہ میرے لئے یہی راہِ نجات اور
طریقِ فلاح ہے، اگر میں ایسا نہ کروں گا اور اس راہ پر نہ چلوں گا تو اللہ کے سخت غضب اور اُس کے
دردناک عذاب کا میں مستحق ہو جاؤں گا ۔ غرض دعوتِ اسلام کو قبول کرتے ہی اور کلمۂ اسلام پڑھتے
ہی یہ یقین اسکے دل و دماغ پر چھا جاتا تھا اور یہی یقین اسلام کے علم و عمل کیلئے اسکو بےچین کرتا رہتا تھا۔

(۲) علم دین کا عموم

ایک طرف تو ایمان و اسلام کی حقیقت کے شعور و ادراک اور اسکی
وجہ سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے احساس کی وجہ سے

علم دین کی طلب عہد نبوی کے ہر مسلمان کے دل میں خود بخود قدرتی طور پر پیدا ہوتی تھی، نیز اسلام سے پہلے اپنے گھر، اپنے خاندان اور اپنے ماحول میں جو جاہلی چال چلن اور جو غیر اسلامی طور طریقے انھوں نے دیکھے اور سیکھے تھے اور جن پر اب تک یہ چلتے رہے تھے، چونکہ اسلام کو حق ماننے کے بعد اُن کا دل و دماغ ان سب طور طریقوں سے منکر اور باغی ہو چکا ہوتا تھا اس لئے دین حق کی بنیادوں پر زندگی کی نئی تعمیر کیلئے بھی دینی معلومات حاصل کرنے کی ضرورت ان کو شدت سے محسوس ہوتی تھی ——

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے دین کی عمومی تعلیم و تربیت کے ایک ایسے سہل طریقے کی طرف حضورؐ کو رہنمائی فرمائی تھی کہ اُس طریق سے ہر شخص کیلئے دین کا ضروری علم حاصل کرنا آسان سے آسان تر تھا، یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر، آپ کی باتیں سُن سُنا کر اور آپ کا طریق عمل دیکھ دیکھ کر ہر شخص بغیر کسی مدرسہ میں داخل ہوئے اور بغیر کسی استاذ کے سامنے کتاب کھولے دین کا علم حاصل کرتا اور اس کا طریق عمل سیکھتا تھا، پھر اسی طرح اُن لوگوں سے بھی اسی طرز پر دین سیکھا جاتا تھا جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت میں اس کو سیکھ چکے ہوتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ نئے ایمان لانے والے پُرانے ایمان والوں کی صحبت سے بھی اسی طرح دین سیکھتے تھے۔ دین کی تعلیم و تعلم کا یہ ایسا سادہ سہل اور فطری طریقہ تھا جس سے ہر عمر اور ہر صلاحیت کا شخص اپنے دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ استفادہ کرتا تھا۔ تعلیم و تعلم کے اسی عام اور فطری طریقے کا نتیجہ تھا کہ قرن اوّل میں ایمان و اسلام ہی کی طرح علم دین بھی عام تھا —— خود رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کو اس کا بیحد اہتمام تھا اور دستور تھا کہ جب دور دراز کا رہنے والا کوئی قبیلہ اسلام قبول کرتا تھا تو آپ ان کی دینی تعلیم و تربیت اور ان میں احکام دین کی تبلیغ کیلئے اپنے معلمین اور مبلغین کو حسب موقع کبھی افراد کی شکل میں اور کبھی جماعتیں بنا بنا کر بھیجتے تھے۔ ان معلمین و مبلغین کا طریقہ تعلیم و تبلیغ بھی وہی ہوتا تھا جو مکہ یا مدینہ میں خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تھا یعنی یہ معلمین وہاں جا کر کوئی مدرسہ یا مکتب نہیں کھولتے تھے اور کتابیں سامنے رکھ کر

درس نہیں دیتے تھے بلکہ لوگوں کے پاس پہنچکر ان کے ساتھ اُٹھ بیٹھ کر دین کی باتیں ان کو پہنچاتے اور رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقۂ زندگی اور آپکے احوال ان کو بتلاتے تھے اور چونکہ ان نو مسلم متعلموں کا ایمان بھی شعوری ہوتا تھا اس لئے یہ لوگ قدر اور طلب کے ساتھ ان معلمین و مبلغین کی صحبتوں سے مستفید ہوتے اور اُن سے دین سیکھتے تھے۔ الغرض تعلیم و تعلم کے اس طریقے سے عہدِ نبوی میں علم دین اس قدر عام ہو گیا تھا کہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ کے لاکھ سے اوپر مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو ضروری درجہ کے علم دین سے جاہل اور اس کے اساسی اصول اور بنیادی تعلیمات سے ناواقف ہو۔ گویا مسلمانوں میں صدی فیصدی دین کے جاننے والے ہی تھے ——
حالانکہ یہ واقعہ ہے جس پر تاریخ گواہ ہے کہ ان میں بکثرت ایسے لوگ تھے جو پڑھے لکھے بالکل نہ تھے یہاں تک کہ اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس اُمیت (یعنی اَن پڑھ ہونے) کے باوجود بفضلہ بالا نبوی طریق تعلیم نے بغیر کتاب اور بغیر قلم دوات کے ان کے دل و دماغ کو علم دین کا حامل اور امین بنا دیا تھا، پھر ان کا یہ علم محض سطحی اور زرا دماغی علم ہی نہ تھا جسکے نمونے اس دور میں ہم بکثرت دیکھ رہے ہیں بلکہ ان کا یہ علم نہایت گہرا اور ایمانی و تصدیقی علم ہوتا تھا جو دل دماغ پر اور پوری زندگی پر اپنا پورا اثر ڈالتا تھا حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کی شہادت ہے، اور ان سے زیادہ سچا شاہد اور کون ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اولئك اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم — حضورؐ کے صحابہؓ لوگوں میں سب سے زیادہ نیکدل اور
ابرّ الناس قلوبا واعمقهم علما۔ — گہرے علم والے تھے۔

اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا جو علم بھی بجائے جامد کتابی نقوش کے چلتے پھرتے زندہ نفوس سے اس طرز پر حاصل کیا جائے گا یقیناً وہ اتنا ہی گہرا، اتنا ہی پختہ اور زندگی پر ایسا ہی اثر ڈالنے والا ہوگا۔
علم دین میں صحابہؓ کے امتیاز اور انکی بلند مقامی کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے

تمام علمی ذخیرے کی سند انہی پر ختم ہوتی ہے، اور انہی کی نقل و روایت اور علم و درایت پر ہمارے سارے دینی علم کا مدار ہے انھوں ہی نے سب سے پہلے قرآن کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لیا اور بعد والوں کو انہی کے ہاتھوں سے ملا۔ علیٰ ہٰذا کتب حدیث میں حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کے جو علوم ہم محفوظ پاتے ہیں اُن سب کی حقیقت بھی بس یہی تو ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے آپ سے جو کچھ سنا اور جس طرح آپ کو کوئی عمل کرتے ہوئے دیکھا اس کو انھوں نے اپنے بعد والوں کو (مثلاً تابعین کو) بتلایا، اور اسی کو حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں سند کے ساتھ محفوظ کر دیا۔

الغرض صحابۂ کرامؓ اور عہد نبویؐ کے مسلمانوں میں اگرچہ پڑھے لکھے زیادہ نہ تھے بلکہ ان میں سے اکثر ناخواندہ اور حرف ناشناس امی ہی تھے لیکن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیض تعلیم و تربیت سے مستفید ہو کر وہ سب علم دین کے عالم و حامل بلکہ معلّم اور مبلغ بن گئے تھے اور کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنے دین کی ضروری واقفیت نہ رکھتا ہو۔

(۱) خوف و خشیت اور ذکر و فکر کا عموم

قرآن مجید میں بڑی صفائی اور صراحت کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ صحیح علم رکھنے والوں ہی میں اللہ کا خوف و خشیہ ہوتا ہے (اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ)

لیکن حالات کے بدلنے سے جہاں اور بہت سی غلط فہمیاں عوام میں پیدا ہو گئی ہیں انہی میں نہایت افسوسناک قسم کی ایک غلط فہمی یہ ہے کہ قرآنی آیات یا احادیث نبویہ میں جہاں "اہل علم" اور "علماء" کا ذکر ہوتا ہے، غیر شعوری طور پر بہت سے حقیقت ناشناس قارئین یا سامعین کا ذہن آج کل کے خاص اصطلاحی "علماء" کے طبقہ کی طرف چلا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ ان آیات یا احادیث میں گویا انہی سند یافتہ علماء ہی کے مناقب بیان کئے گئے ہیں۔ حالانکہ جس وقت قرآن پاک نازل ہوا ہے اور جس فضا میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے یہ ارشادات ادا ہوئے ہیں

اس وقت علماء کے اس اصطلاحی طبقہ کا وجود بلکہ تصور بھی نہ تھا۔ آیات و احادیث میں "علماء" یا "اولوا العلم" یا "الذین یعلمون" جیسے الفاظ جہاں آتے ہیں تو عموماً ان سے اللہ و رسول کی معرفت رکھنے والے اور دین کے جاننے والے لوگ مراد ہوتے ہیں، خواہ وہ اصطلاحی "عالم" ہوں یا نہ ہوں ——— خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا ورنہ ہمارا مدعا تو یہاں صرف یہ تھا کہ صحابۂ کرام میں چونکہ سب ہی خدا شناس اور دین کے جاننے والے تھے اس لئے وہ سب ہی اللہ سے ڈرنے والے، اس کو یاد رکھنے والے اور اس کے عذاب اور آخرت کے مواخذہ و حساب سے لرزاں و ترساں اور فکرمند رہنے والے تھے، وہ رات کی تنہائیوں میں آخرت کی باز پرس کو یاد کر کرکے اتنا روتے تھے کہ داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں اور یہ اُن کے خاص افراد ہی کی حالت نہ تھی بلکہ اسوقت کا عام حال یہی تھا۔

الغرض عہدِ نبویؐ کے عام مسلمان حقیقی اور شعوری ایمان و اسلام سے بہرہ ور اور علم دین کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ سب کے سب اصحاب خوف و خشیت اور اہلِ تقویٰ تھے، قیامت کا یقین ایسا بڑھا ہوا تھا کہ گویا انھوں نے اس کو آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ حضرت حسن بصریؒ نے کتنے مختصر اور بلیغ فقرہ میں اُنکی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے "کانھم رای عین" "آخرت کی فکر اُن پر ایسی چھائی رہتی تھی کہ گویا میدانِ حشر اپنی ساری ہولناکیوں سمیت اُنکی آنکھوں کے سامنے ہے" اسی وجہ سے غافلوں کی سی چین و آرام اور اطمینان کی زندگی سے وہ بالکل آشنا نہیں رہے تھے۔

(۴) علم پر عمل اور پیرویِ احکام کا عموم

پھر ان تینوں اوصاف (شعوری اسلام، علم دین، اور خوفِ خدا و فکرِ آخرت) نے اُن میں عمل اور احکام کی اطاعت و پیروی کو بھی اسی طرح عام کر دیا تھا، بلا کسی مبالغہ کے کہا جا سکتا ہے کہ اُن میں سے جس کو دین کا جس قدر علم تھا وہ اُس پر عمل کرنے اور اُسکے مطابق زندگی

گذارنے کا پورا عزم رکھتا تھا اور اس کی پوری کوشش کرتا تھا ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو نماز کی فرضیت کا علم تو رکھتا ہو مگر نماز نہ پڑھتا ہو، جماعت کی فضیلت و اہمیت اس کے علم میں آچکی ہو اور پھر جماعت کی پابندی کی کوشش نہ کرتا ہو، زکوٰۃ کی فرضیت معلوم ہو لیکن زکوٰۃ دینا نہ چاہتا ہو، روزہ کے متعلق اسلام کے مطالبہ سے وہ باخبر ہو مگر روزہ نہ رکھتا ہو، اور یہ حال صرف عبادات ہی میں نہیں تھا بلکہ اخلاق و معاملات اور آداب معاشرت وغیرہ جملہ ابواب زندگی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو تعلیمات اور اسلام کے جو احکام ان کے علم میں آتے تھے اُن سب کی تعمیل میں اُن کا یہی حال تھا، اور اگر بتقاضائے بشری اُن سے کوئی کام خلاف حکم شریعت سرزد ہو جاتا تھا تو احساس ہو جانے پر وہ فوراً توبہ و استغفار سے اُس کے داغ کو دھونے کی کوشش کرتے تھے، روتے روتے ان کی داڑھیاں تر ہو جاتیں اور آنکھیں سوجھ جاتی تھیں، کبھی کبھی خود آکر حضورؐ سے اپنا خطا و قصور بیان کرتے اور آپؐ سے استغفار کی درخواست کرتے تھے، اور اگر "حد" جاری ہونے کے قابل گناہ ہوتا تو خود ہی حاضر ہو کر اپنے گناہ کی خبر دیتے اور اجراء "حد" (شرعی سزا) کے لئے خود اپنے کو پیش کرتے تھے اور اس حد میں اپنی جان تک جانے کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے قرن اول کی تاریخ اور کتب احادیث ہمارے اس بیان کی پوری پوری گواہ ہیں۔

غرض اوامر شرعیہ کی بجا آوری اور منہیات و ممنوعات سے اجتناب بھی قرن اول کے مسلمانوں میں ایمان و یقین اور علم دین ہی کی طرح عام تھا، بلکہ اس سے ایک درجہ اور ترقی کر کے کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز (یعنی دینی احکام پر عمل) ایمان و یقین سے بھی زیادہ عام تھا، جن لوگوں کو عہدِ نبویؐ کے متعلق کچھ معلومات ہیں وہ بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ جو منافقین ایمان و یقین کی دولت سے محروم تھے اور جن کے دلوں میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق بھی شکوک تھے اگر اپنے کچھ منافع اور مصالح کیلئے وہ اپنے کو مسلمان شمار کرانا چاہتے تھے، تو

وہ بھی ماحول کے دباؤ سے اسلامی احکام پر عمل کرنے پر ایسے مجبور تھے کہ اگرچہ اُن کا دل نماز پڑھنا
بالکل نہیں چاہتا تھا مگر مسلمانوں کے ساتھ شانہ بشانہ صفوں میں کھڑے ہو کے نماز پڑھنی پڑتی تھی
زکوٰۃ و صدقات اگرچہ اُن کیلئے تاوان اور وبالِ جان تھے مگر ان کو ان میں بھی عملی حصہ لینا پڑتا تھا
حتیٰ کہ بسا اوقات جہاد کے لئے بھی ساتھ نکلنا پڑتا تھا، کیونکہ اس فضا میں عملاً اسلام پر اس طرح
چلنا اور اس کے حکموں کی پیروی کرنا ہر مسلمان کا لازمی اور عمومی وصف تھا جس کے بغیر کوئی شخص
مسلمان سمجھا ہی نہیں جا سکتا تھا، اور نہ کوئی اپنے کو مسلمان کہلانے کی جرأت ہی کر سکتا تھا۔

بہرحال قرنِ اول میں دینی مطالبوں کے مطابق زندگی گذارنا اور احکام شرعیہ کی عملاً پابندی
کرنا حقیقی ایمان اور شعوری اسلام سے بھی زیادہ عام تھا۔

(۵) دین کیلئے جدوجہد اور اس راہ میں محنت و قربانی کا عموم

اسی طرح اعلاءِ کلمۃ اللہ اور

دین حق کے فروغ کے لئے اپنی اپنی اہلیت و صلاحیت کے مطابق جدوجہد کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت و دعوت کا حلقہ وسیع کرنے اور غافل و خدا فراموش انسانوں کو اللہ
کی بندگی کے صحیح راستہ پر لگانے کے واسطے محنت و مشقت برداشت کرنا اور اس راہ میں اپنے وقت
اپنے چین و آرام اور اپنے جان و مال کی قربانی کرنا بھی قرن اول کے تمام مسلمانوں کا عمومی وصف تھا،
اس سے نہ کوئی امیر مستثنیٰ تھا نہ غریب، نہ تاجر نہ دکاندار، نہ مزدور نہ کاشتکار، نہ جدید الاسلام
نہ قدیم الاسلام، اس بارے میں اسلام کا مطالبہ اتنا سخت و ہمہ گیر اور اس قدر انتہا پسندانہ تھا کہ
جب انصار کی ایک جماعت نے کئی برس تک متواتر اس جدوجہد میں مشغول رہنے اور اس راہ میں
ہر طرح کی جانی و مالی قربانیاں کرنے کے بعد (جب کہ انکی جدوجہد اور قربانیوں نے دین کے ہزاروں
نئے خدمت گذار اور فداکار پیدا کر دیئے تھے) کچھ مدت کے واسطے اپنے کاروبار اور اپنی کھیتی باڑی

اور باغات کی اصلاح و خبرگیری کیلئے اس جدوجہد سے رخصت چاہی تو آیت نازل ہوئی۔

لَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ — اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو

گویا انفرادی فرائض (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ) پوری طرح ادا کرتے ہوئے بھی دین کی خدمت و نصرت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد سے سبکدوش ہو کر صرف کاروباری زندگی گذارنے کو خودکشی قرار دیا گیا۔ قرآن مجید کی عام پکار تھی۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاھِدُوْا بِاَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (سورۂ توبہ)

ایمان والو! (دین کے فروغ کی کوشش اور اعلاء کلمۃ الحق کی جدوجہد کیلئے) گھروں سے نکلو، اور چل پڑو خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری (یعنی تمھارے لئے اس راہ میں نکلنا خواہ آسان ہو یا دشوار) اور اللہ کے اس راستہ میں جان و مال سے کوشش کرو۔

اور یہ تک سنا دیا گیا تھا۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّ یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَلَا تَضُرُّوْہُ شَیْئًا (سورۂ توبہ)

اگر تم دین کی سربلندی کی کوشش کیلئے نہ نکلے تو اللہ تم کو دردناک عذاب دیگا اور تمھاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

چنانچہ جن مومنین مخلصین (حضرت کعبؓ وغیرہ) سے ایک دفعہ محض سستی کی وجہ سے غیر قصدی طور پر اس بارہ میں کوتاہی ہوئی تو ان پر سخت عتاب ہوا، تمام اہل ایمان کو اُن کے سلام کلام تک سے منع کر دیا گیا حتیٰ کہ ان کی بیویوں کو بھی حکم دے دیا گیا کہ وہ ان کی کوئی خدمت نہ کریں، قریب سے قریب عزیزوں نے بھی اُن سے تعلقات توڑ دیئے اور بولنا چالنا چھوڑ دیا، یہاں تک کہ پورے شہر مدینہ میں کوئی اُن کی بات پوچھنے والا، اُن سے خطاب کرنے والا اور اُن کی بات کا جواب

پینے والا نہ تھا ـــــ پورے پچاس دن تک اُن کو یہ سخت جسمانی و رُوحانی سزا دینے کے بعد اُن کی توبہ کی قبولیت اور معافی کا اعلان کیا گیا۔

اور یہ معاملہ تو اعلیٰ درجہ کے مخلصین کے ساتھ ہوا، ان کے علاوہ منافق قسم کے جن لوگوں نے دین کی جدوجہد میں حصہ لینے سے جان چرائی اور حیلے بہانے کئے روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالآخر اُن کی منافقت کا اعلان کرکے اپنی مسجد تک سے اُن کو نکال دیا۔

بہرحال قرنِ اوّل میں دین کی نصرت و خدمت اور اس کے فروغ کی جدوجہد ہر مسلمان کیلئے لازم اور اسلامی زندگی کا جزو لاینفک تھی سخت قرآنی مطالبات اور تنبیہات کے علاوہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دائماً اس درد سے بے قرار اور اس مقصد کے لئے بے چین رہنا ہر سچے مومن کے لئے سب سے بڑا محرک اور نہایت طاقتور داعیہ تھا، صحابہ کرام رضکیلئے ممکن نہ تھا کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) کو وہ بے چین، متحرک اور جدوجہد میں مصروف دیکھتے اور خود اپنے گھروں اور اپنے بیوی بچّوں میں آرام اور سکون کی زندگی گذارتے۔

تاریخ گواہ ہے کہ مکّہ معظمہ کے زمانۂ قیام میں جبکہ رسُول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی دینی جدوجہد خفیہ یا علانیہ دعوت و تبلیغ اور اس راہ کی مشقتوں کی شکل میں تھی تو اُس وقت کے تمام مومنین اپنی اپنی ہمّت و صلاحیت کے مطابق دعوت کے اس کام میں آپؐ کے شریک اور اُس کی مصیبتوں کی برداشت میں پورے حصّے دار تھے، اور جب مدینۂ طیبہ پہونچکر جہاد کی صورت پیدا ہوئی تو اس میں بھی برابر حصّہ دار رہے، اور درحقیقت یہی اسلامی زندگی کی اصل حسنات تھی، اور اس کے خلاف جو صورت بعد میں پیدا ہوئی کہ اس کو عام مسلمانوں کے فرائض سے خارج سمجھا گیا اور صرف کسی خاص طبقہ کی ذمہ داری سمجھ لی گئی تو یہ ایک نہایت غلط قسم کی تحریف ہوئی۔ قرنِ اوّل میں ہرگز یہ نظریہ موجود نہ تھا، وہاں جو بھی اسلام کا کلمہ پڑھتا تھا اور

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا تھا وہ اپنی حالت و استطاعت کے مطابق انسانی زندگی کی عام مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ دین کی خدمت و نصرت اور اس کے فروغ کی کوشش میں ضرور بالضرور عملی حصہ لیتا تھا اور یہی ان سے اسلام اور قرآن پاک کا مطالبہ تھا۔

(۶) اخلاص اور احتساب کا عموم

قرن اول کے اہلِ ایمان میں مذکورہ بالا اوصاف کے علاوہ ایک اور نہایت اہم اور اعلیٰ درجہ کا روحانی وصف بھی عام تھا جس کو ان کی اسلامی زندگی کا قلب کہا جا سکتا ہے، اس سے ہماری مراد "اخلاص و احتساب" ہے ـــــــ یہ دونوں خاص دینی اصطلاحیں ہیں اخلاص سے مراد یہ ہے کہ اپنے کو اللہ کا بندہ اور اللہ کو اپنا مالک و مولا اور معبود برحق سمجھتے ہوئے اور اس کے احکام کو واجب التعمیل اور ان کی فرمانبرداری کو وسیلۂ نجات جانتے ہوئے ہر دینی کام اس کی حکم برداری کی نیت سے اور اس کی رضا جوئی ہی کے لئے کیا جائے، اور "احتساب" سے مراد یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں جن جن اعمال کا جو ثواب بتلایا گیا ہے یا جن بداعمالیوں اور برائیوں پر جس قسم کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ غرض قرآن و حدیث کے ان تمام وعدوں اور وعیدوں کو برحق یقین کرتے ہوئے اور ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس عذاب سے بچنے اور ثوابِ موعود حاصل کرنے کے لئے دینی احکام پر عمل کیا جائے ـــــــ یہ دونوں وصف گویا رُوحِ دین اور قلبِ اسلام ہیں اور ان کے مجموعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام دینی احکام کی تعمیل کا اصلی محرک اپنے مالکِ حقیقی کے حکموں کی بجا آوری کا ارادہ، اس کی رضا کا فکر اور اخروی زندگی کا اندیشہ ہو یعنی جو کچھ بھی کیا جائے صرف اس کی رضا جوئی کے لئے اس کے عذاب کے خوف سے، اور اس کے مقرر کئے ہوئے ثواب کی طمع میں کیا جائے ـــــ یا اس سے بھی مختصر لفظوں میں یوں کہا جائے کہ ـــــ احکام دین کی تعمیل اور دینی زندگی کی تشکیل میں اصلی عامل رغبت و رہبت

یعنی ثواب کی اُمید اور عذاب کا خوف ہی ہو ـــــــ اس طرح ہر چھوٹے بڑے عمل کا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه سے ایک خاص قریبی ربط قائم ہو جاتا ہے اور اس نیت سے جو چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی کیا جائے تو اس کا وزن بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے ـــــ آج اگرچہ اس کی کمیابی کی وجہ سے اس وصف کا ادراک بھی مشکل ہے لیکن صحابۂ کرام رضی کی زندگیوں کا جنھوں نے زیادہ غور سے مطالعہ کیا ہوگا وہ ضرور اس سے واقف ہوں گے کہ اس عہد میں ایمان و یقین اور علم دین وغیرہ اوصاف مذکورہ کی طرح یہ وصف بھی عام تھا اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و تربیت اور فیضِ صحبت نے سب کو ہی اس رنگ میں رنگ دیا تھا۔

(۷) یقین و توکل اور دُعا و استعانت کا عموم

اسی طرح عہدِ اوّل کے اہلِ ایمان میں ایک خاص وصف یہ بھی عام تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم و ہدایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی خداوندانہ قدرتوں پر پورا پورا یقین اور اس کی وجہ سے حقیقی توکل ان کو حاصل تھا، ہر معاملہ کو وہ خدا ہی کے زیرِ حکم اور تحتِ مشیت یقین کرتے ہوئے اپنی ہر چھوٹی بڑی شخصی یا جماعتی حاجت میں وہ پورے الحاح اور تضرع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور اس اعتماد کے ساتھ اس سے دعا کرتے اور مدد مانگتے تھے کہ اس کا کرم ہی بیڑے کو پار لگانے والا ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے فیضِ صحبت نے یہ رنگ ان پر ایسا چڑھایا تھا کہ ہر معاملہ میں ان کے قلوب اللہ تعالیٰ کی کارسازی پر بھروسہ اور آسرا کرتے ہوئے سب سے پہلے اسی کے لطف و کرم کے ملتجی ہوتے تھے اور زبانوں پر دُعائیں جاری۔ الغرض یقین و توکل، اللہ کی طرف رجوع و انابت اور اس سے دُعا و التجا اور استغاثہ و استعانت صحابۂ کرام رضی کا عمومی حال تھا، اور اللہ پاک کا اُن کے ساتھ رحمت و نصرت کا جو خاص معاملہ تھا اُس میں ان کی اس صفت کو بہت بڑا دخل تھا۔

(۸) ایک دوسرے کی حق شناسی اور باہمی ہمدردی و غمخواری کا عموم!

عہدِ نبویؐ کے اہلِ ایمان میں ایک دوسرے کی حق شناسی اور باہمی ہمدردی و غمخواری کی صفت بھی عام تھی — قرآن مجید میں (رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ) اور (یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ) جیسے شاندار الفاظ میں ان کی اس عمومی صفت کا تذکرہ کیا گیا ہے، مزید توضیح و تفصیل کے لئے اس کی دو عملی مثالیں بھی یہاں ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن سے اس صفت کے عموم کا آپ کو کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

۱ — ابوجہم بن حذیفہ راوی ہیں کہ یرموک کی لڑائی میں میرے ایک چچازاد بھائی شریک تھے، ایک دن جب ان کا کوئی پتہ نہ چلا تو میں اُن کی تلاش میں میدانِ جنگ کی طرف نکلا اور اس خیال سے کہ مبادا کہیں وہ پیاس کی حالت میں پڑے ہوں۔ میں نے اپنے ساتھ پانی کا ایک مشکیزہ بھی لے لیا، اتفاق سے وہ ایک جگہ ایسی حالت میں پڑے ہوئے ملے کہ بس دم توڑ رہے تھے اور جان کنی شروع تھی، میں نے پوچھا کہ پانی کا گھونٹ دوں؟ انھوں نے اشارے سے ہاں کی، میں مشکیزہ سے پانی لے رہا تھا کہ اتنے میں ایک دوسرے صاحب نے جو قریب ہی زخمی پڑے تھے اور نزع ہی کی حالت میں تھے آہ کی، میرے بھائی نے اشارہ سے پہلے انھیں پانی دینے کیلئے کہا، میں ان کے پاس پہنچا وہ ہشام بن ابی العاصؓ تھے، ابھی میں انھیں پانی دے نہیں سکا تھا کہ ایک تیسرے صاحب کی ویسی ہی آواز آہ کی آئی، یہ بھی بالکل آخری حالت میں تھے، ہشام نے مجھے اشارہ کیا کہ پہلے ان کو پانی پہنچاؤ، میں ان کے پاس پانی لے کر پہنچا تو ان کا سانس ختم ہو چکا تھا اور جان بحق ہو چکے تھے، اُن کے پاس سے میں پھر ہشام کے پاس لوٹا تو وہ بھی ختم ہو چکے تھے، پھر جب اپنے بھائی کے پاس آیا تو وہ بھی واصل بحق ہو چکے تھے۔ (درایہ)

۲۔ درمنثور میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ مروی ہے کہ کسی صحابی کے یہاں بکری ذبح ہوئی، انھوں نے اس کی سری اپنے کسی ساتھی کو ہدیہ کے طور پر دی، انھوں نے سوچا کہ میرے فلاں ساتھی زیادہ ضرورت مند اور بڑے کنبہ والے ہیں اس لئے وہ سری انھوں نے اُن کے یہاں بھیجدی، ان کو ایک تیسرے صحابی کے متعلق یہی خیال پیدا ہوا اور انھوں نے وہ اُن کے گھر بھیجدی، اس طرح وہ سری سات گھروں میں پھر کر پہلے صحابی کے گھر ہی لوٹ آئی۔

صحابۂ کرامؓ کے تذکروں میں ایسے واقعات بے گنتی موجود ہیں خاص یہ دو یہاں اس لئے ذکر کئے گئے ہیں کہ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وصف صحابۂ کرامؓ کے خاص افراد ہی میں موجود نہ تھا بلکہ یہ اُن کی جماعتی سیرت تھی، اُن میں کا ہر فرد دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتا تھا۔

(۹) ہر چیز سے زیادہ خدا اور رسولؐ کی محبت کا عموم

صحابۂ کرامؓ کا ایک خاص الخاص وصف جو ان کی پوری جماعت میں عام تھا اور جس کو ہم ایمان کے بعد اُن کی پوری دینی زندگی کی روح کہہ سکتے ہیں، وہ یہ تھا کہ خدا اور رسولؐ کی محبت ان کو ہر چیز سے زیادہ تھی، محبت سے یہاں مراد صرف عقلی اعتراف، یا محض اعتقادی و عملی تسلیم و انقیاد نہیں ہے جیسا کہ بہت سے ناآشنایانِ حقیقت کا خیال ہے بلکہ وہی "عشق و محبت" جو ایک معروف حقیقت ہے اور جو محب صادق کو بس محبوب کا بنا دیتی ہے۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن

بہرحال صحابۂ کرامؓ کو اللہ و رسولؐ کے ساتھ وہی محبت حاصل تھی۔ اللہ کی محبت کے متعلق تو خود قرآن مجید گواہ ہے کہ (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) یعنی ایمان والوں کو سب سے زیادہ

محبت اللہ کی ہے ـــ اور حضرت علی مرتضےٰ (رضی اللہ عنہ) سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ لوگوں کو رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) سے کتنی محبت تھی ؟ تو آپ نے فرمایا۔

خدا کی قسم حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) ہم لوگوں کو اپنی جانوں، اپنے مالوں، اپنی اولادوں، اپنی ماؤں، اور سخت پیاس کے وقت ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے۔ (شفا)

حضور (صلے اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ صحابہؓ کے عشق و محبت کا جو حال تھا "صلح حدیبیہ" کی گفتگو کے دوران میں قریش مکہ کے سفیر عروہ بن مسعود ثقفی نے اس کا جو منظر دیکھا اور جو اس نے جا کر کفار مکہ کی مجلس میں بیان کیا تھا وہ آج تک صحیح بخاری اور دوسری کتب حدیث میں محفوظ ہے اس نے کہا تھا۔

اے میری قوم کے لوگو میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں، قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں کا منظر بھی میری آنکھوں نے دیکھا ہے، میں نے نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کی رعیت اپنے بادشاہ کے ساتھ عظمت کا وہ معاملہ کرتی ہو جو محمدؐ کے اصحابؓ ان کے ساتھ کرتے ہیں، وہ جب تھوکتے ہیں تو ان کے فدائی تھوک کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اپنے منھ اور بدن پر مل لیتے ہیں اور جب وہ کسی کام کو کہتے ہیں تو ہر ایک دوسرے سے پہلے اور آگے بڑھ کر اس کو کرنا چاہتا ہے اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو یہ پروانہ وار آپؐ کے وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں اور اس کیلئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اور جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کی آوازیں ادب سے نہایت پست ہو جاتی ہیں اور احترام و وقار کی وجہ سے

آنکھ بھر کے یہ ان کی طرف دیکھتے بھی نہیں ہیں۔ (صحیح بخاری)

یہ حال جو بیان کیا جا رہا ہے مخصوص افراد کا نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کا حال ہے اور روایت بھی کسی دوست اور معتقد کی نہیں ہے بلکہ دشمنوں کے سفیر اور نمائندہ کی ہے جو اُس نے اپنے لوگوں کے سامنے بیان کی ہے، بس اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ صحابۂ کرام رضؓ کے عشق و محبت کا حال کیا تھا، درحقیقت یہی چیز تھی جس نے صحابۂ کرام رضؓ کی پوری زندگی کو شروع سے آخر تک پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ عشق و محبت کے سوا کسی دوسری چیز میں انقلاب کی اتنی طاقت نہیں۔ ؎

عشق کی ایک جست نے کر دیا قصہ تمام!
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

(۱۰) کفر و شرک کی حقارت و نفرت اور اہلِ کفر و شرک سے بے تعلقی و بیزاری کا عموم

اور جس طرح صحابۂ کرام رضؓ میں شعوری ایمان اور دین کے ضروری علم کی فکر اور احکام کی پیروی اور خدا ترسی و خدا طلبی عام تھی، اور جس طرح دین کے لئے جد و جہد اور یقین و توکل اور اخلاص و احتساب اور ایمانی اخوت و حق شناسی اور ہر چیز سے زیادہ اللہ و رسولؐ کی محبت کی صفات اُن میں عام تھیں۔ اسی طرح یہ بات بھی اُس دور کے تمام اہلِ ایمان میں بالعموم پائی جاتی تھی کہ کفر اور شرک کی تمام صورتوں سے وہ ہر گندگی سے زیادہ نفرت کرتے تھے اور انسانوں کے تمام عیبوں اور روگوں میں سب سے بڑا عیب اور گھناونا روگ وہ کفر و شرک کو سمجھتے تھے، اور اگرچہ اہلِ کفر و شرک کے عام انسانی حقوق کی ادائگی وہ اپنا فرض جانتے تھے اور ایمان و معرفت

کی دولت سے ان کی محرومی پر ترس کھاتا اور اس دولت کو کسی طرح ان کو پہنچا دینا وہ اپنا فریضہ سمجھتے تھے لیکن اتمام حجت کے بعد اور حقوقِ انسانیت کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے ان اہلِ کفر و شرک سے مودت و محبت کے رشتے توڑ لینا اور اُن سے بے تعلق اور بیزار ہو جانا وہ اپنے لئے ضروری سمجھتے تھے، اور گویا قرآن مجید کا یہ ارشاد اُن سب کا دستور عمل تھا۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ ؕ

(سورۂ ممتحنہ)

تمہارے لئے اچھا نمونہ ہے ابراہیم میں اور اُن کے ساتھیوں میں جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے شرکانہ طریقے سے اور اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو اُن سب سے بے تعلق اور بیزار ہیں۔ ہمیں تم سے اور تمہارے اس طریقے سے انکار ہے اور ہمارے تمہارے درمیان (محبت و مودت کے بجائے) بغض و عداوت پیدا ہو چکا ہے، اور یہ صورت حال اُس وقت تک رہے گی کہ تم اللہ واحد پر سچا ایمان لے آؤ۔

یہاں تک ہم نے صحابۂ کرامؓ کے جو دس ایمانی اوصاف ذکر کئے ہیں (جن میں بعض باہم گر لازم و ملزوم یا اصل و فرع کی بھی نسبت رکھتے ہیں) درحقیقت انہی اوصاف کو معیار قرار دے کر ہم قرن اول کی "خیر امت" اور آج کی "مسلمان قوم" کے فرق کو سمجھ سکتے ہیں اور اس کے بعد ہی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ "کاروانِ اُمت" کہاں سے چل کر کہاں جا گرا ہے۔

خیر اُمت کا حال تو آپ کو معلوم ہو چکا کہ اُس کا ہر فرد حقیقی ایمان و اسلام کا حامل، دین کے اساسی مقاصد اور اس کے عام اصولی مطالبوں سے واقف اور اس کے مطابق پوری طرح عمل

کرنے والا تھا، ہر ایک خدا کی گرفت کے خیال سے لرزاں و ترساں اور آخرت کی فکر رکھنے والا اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کے سامنے رونے والا تھا، ہر ایک دین کے فروغ اور اس کی ترقی و سربلندی کیلئے عملاً جدوجہد کرنے والا اور اس راہ میں جان و مال کو قربان کرنے والا تھا، ہر ایک میں اخلاص و احتساب کی روح تھی، ہر ایک کو یقین و توکل اور اللہ پر کامل اعتماد حاصل تھا، ہر ایک دوسرے مسلمان بھائی کا حق شناس اور اخوت ایمانی کی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والا تھا، اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اللہ و رسولؐ کی محبت ان میں سے ہر ایک کو تمام ماسوائے زیادہ تھی، خدا اور اس کے راضی کرنے کے لئے وہ اپنے غلط کار ماں باپ، خدا سے باغی اپنی آس اولاد، اپنے عزیزوں، قریبوں، اپنی چہیتی بیویوں، اپنے مکانات اور اپنی جائداد اور باغات سب کو چھوڑ سکتے تھے اور امتحان کا وقت آنے پر بے دریغ چھوڑ دیتے تھے لیکن کسی حال میں بھی اللہ و رسولؐ کی رضا جوئی سے دستبردار یا اس میں تساہل و تغافل کے وہ روادار نہ تھے ـــــ اور بیشک یہی تھا حقیقی اسلام! اور یہی ہے گا قیامت تک کے لئے اسلام و ایمان کا مثالی نمونہ۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

موجودہ مسلمان قوم پر ایک نظر

اب ذرا موجودہ "مسلمان قوم" پر بھی ایک نظر ڈال کر دیکھئے!

اس وقت دنیا میں "مسلمانوں" کی تعداد چالیس کروڑ سے ستر اور اسی کروڑ تک بتلائی جاتی ہے اور دنیا کی سیاحت کرنے والے یہ بھی بتلاتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی "ہندوستان" کے مسلمانوں کی دینی حالت دوسرے ممالک سے کچھ غنیمت ہی ہے، لیکن ان غنیمت والے "مسلمانوں" کا بھی جو حال ہے آنکھوں کے سامنے ہے، ذرا دیہات کے مسلمانوں اور شہروں کے غریب مسلمان مزدوروں کا اور ساتھ ہی کالجوں سکولوں کے تعلیم یافتہ دیمبر لیڈروں کا تفصیلی نظر سے جائزہ لیجئے اور پھر حساب لگائیے

کہ آج کروڑوں کی "اس مسلمان قوم" میں کتنے ہیں جو اپنے مسلمان ہونے کی حقیقت جانتے ہیں؟ کتنے ہیں جو اسلام کے اصول و مقاصد اور اس کی ضروری تعلیمات سے واقف ہیں؟ کتنے ہیں جن کے دلوں پر اللہ کا خوف طاری رہتا ہے اور محاسبۂ آخرت کی فکر کی وجہ سے جو راتوں کو بھی اٹھ اٹھ کر اللہ کے سامنے روتے ہیں؟ کتنے ہیں جو دین کی سربلندی و سربلندی اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے کوشاں و سرگرداں رہتے ہیں؟ کتنے ہیں جن کی ساری سعی و جہد اور تگ و دو صرف رضاء الٰہی کے لئے ہو اور اخلاص و احتساب اُن کا حال ہو؟ کتنے ہیں جو یقین و توکل کے سرمایہ دار ہیں اور دعا و استغاثت اُن کے قلب و زبان کا وظیفہ ہے؟ کتنے ہیں جو اشداء علی الکفار رحماء بینھم کا نمونہ ہیں اور اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکٰفرین اُن کی شان ہو؟ اور کتنے ہیں جن کو اللہ و رسولؐ کی محبت ہر چیز سے زیادہ ہے اور جو اپنے ہر رشتہ کو، اپنے نفس کی ہر خواہش اور ہر چاہت کو، اپنی ہر منفعت اور مصلحت کو اللہ کی رضا اور رسولؐ کی پیروی کی راہ میں چھوڑ دیتے ہوں اور اپنی جان تک کی قربانی سے بھی دریغ نہ کرتے ہوں، مگر کسی عزیز سے عزیز چیز اور بڑی سے بڑی منفعت کے لئے بھی اللہ و رسولؐ کو ناراض کرنا نہ چاہتے ہوں ——— کیا موجودہ مسلمان قوم میں فیصدی ایک یا فی ہزار ایک میں بھی یہ اوصاف موجود ہیں؟ حالانکہ عرض کیا جا چکا ہے کہ "خیر امت" کے یہ عمومی اوصاف تھے اور اس کا ہر ہر فرد ان اوصاف میں کم یا بیش اپنا حصہ ضرور رکھتا تھا۔

اب صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے، اب جو قوم مسلمان کہلاتی ہے اس میں حقیقی اسلام و ایمان کی جگہ اسلام کے ساتھ نسلی و موروثی نسبت اور نام کی مسلمانی عام ہے، دین سے واقفیت کی بجائے ناواقفیت اور اس کے اصولوں سے جہالت عام ہے، بدعملی اور احکام خدا و رسولؐ کے خلاف چلنا عام ہو۔ علیٰ ہذا ذکر کی جگہ غفلت و خدا فراموشی اور بجائے خشیت و تقویٰ کے آخرت سے بے فکری عام ہے، دین کے لئے جد و جہد اور اس کی راہ میں محنت و قربانی کو

کو بالکل بھلا ہی دیا گیا ہے اور اس کے بجائے صرف اپنی مادی اغراض اور ہوئے وہوس کے لئے یا اپنی ناموری اور اقتدار کے لئے جد و جہد ہی کا رواج رہ گیا ہے۔ اسی طرح اخلاص و احتساب اور یقین و توکل جیسے اہم دینی حقائق بالکل عنقا ہو گئے ہیں، اور اُن کے بجائے خود غرضی، نفس پروری اور مادہ پرستی آج کل بالکل عام ہے۔ اخوت ایمانی، عام مسلمانوں سے قریباً بالکل مفقود ہو چکی ہے، اور (اذلۃ علی المومنین) اور (رحماء بینھم) کا قضیہ اب بالکل معکوس ہے ——— اگرچہ کوئی اس تغیر و انحطاط کا اقرار و اعتراف نہ کرے مگر مشاہدہ یہ ہے کہ موجودہ مسلمان قوم کا عام حال یہی ہے کہ معمولی اغراض اور ادنیٰ درجہ کی نفسانی خواہشات و جاہت بھی خدا و رسول کی محبت پر عملی دنیا میں غالب آ چکی ہے۔

بہر حال قرنِ اوّل کی "اُمّتِ مسلمہ" میں جو جو ایمانی اوصاف عام تھے آج کی "مسلمان قوم" میں اُن کے اضداد (کا فرانہ اوصاف) عام ہیں اور وہ ایمانی اوصاف جمہور سے نکل کر صرف خواص کے ایک محدود دائرہ میں سمٹ آئے ہیں، دین والوں کی وابستگی چونکہ عموماً انہی دینی دائروں سے ہے اس لئے وہ ہی ان کی نظروں میں سمائے ہوئے ہیں اور اس لئے جمہور امت یعنی "مسلمان قوم" میں دینی لحاظ سے جو غیر معمولی تغیر و انقلاب ہو چکا ہے اس کا اندازہ بھی ان کو آسانی سے نہیں ہو سکتا ہے۔

اس عاجز راقم سطور نے مختلف علاقوں کے دیہاتی مسلمانوں، شہری غریبوں، مزدوروں، دست گردوں، قلیوں، گھوسیوں، تیلیوں، بھشتیوں، دھوبیوں وغیرہ کے دینی حالات کے بارہ میں معلومات حاصل کی ہیں اور کالجوں، سکولوں کے گریجوٹوں، یا طالب علموں کے متعلق جو کچھ میرے معلومات یا محسوسات ہیں اُن سب کا حاصل یہی ہے کہ موجودہ مسلمان قوم میں حقیقی اسلام و ایمان اور اس کے لازمی اوصاف بہت ہی خاص خاص حلقوں اور مخصوص ہی افراد میں باقی ہیں، اسکے

علاوہ میں بس اسلام کا نام ہے اور کچھ قومی عصبیت بلکہ ہندوستان کے تازہ سیاسی انقلاب کے بعد سے تو وہ قومی عصبیت بھی بہت تیزی کے ساتھ مٹتی جا رہی ہے۔

حاملانِ دین کا فریضہ

خاتم الانبیا صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے انبیا سابقین کی امتوں میں جب اتنا فساد و ضلال پیدا ہو جاتا تھا اور اپنے دین سے جب وہ اس قدر دور ہو جاتی تھیں تو ان کی اصلاح اور دعوتِ دین کے از سرِ نو احیاء کے لئے دوسرے نبی بھیج دیئے جاتے تھے اب قرآن پاک کے بعد کسی نئی نبوت کی ضرورت تو نہیں رہی لیکن امت کی اصلاح اور دعوت دینی کے احیاء کا کام اُن تمام لوگوں کے ذمہ ہے جو اس امانتِ نبوی کے حامل ہیں یعنی جو بفضلہ تعالیٰ اس دورِ فساد میں بھی اس دین پر قائم ہیں اور اس کے جاننے والے اور اس پر عمل پیرا ہیں۔

ہماری دعوت کا مقصد

جس دینی دعوت اور اصلاحی جد و جہد کی طرف اس مقالہ کے ذریعہ توجہ دلانا مقصود ہے در اصل وہ اسی فرض کے احساس کا نتیجہ اور اسی فریضہ کی ادائگی کی ایک کوشش ہے ـــــ اس کا مقصد وحید یہی ہے کہ دین اسی طرح زندہ اور ترو تازہ ہو جیسا کہ وہ کبھی تھا اور مسلمان ویسے مسلمان ہوں جیسا کہ انھیں ہونا چاہیے، ان کا ایمان حقیقی ہو اور اسلام شعوری، ان میں دین کی واقفیت عام ہو، دینی احکام کی پابندی اور پیروی عام ہو، اللہ کا خوف اور آخرت کی فکر عام ہو، ان کے دل اور ان کی زبانیں اللہ کو یاد کرنے والی اور آنکھیں رونے والی ہوں، وہ اصحابِ اخلاص و احتساب اہل یقین و توکل کے سرمایہ دار ہوں، دین کی سربلندی کی فکر ان کی سب سے بڑی فکر ہو، اور اس کیلئے

سی وجد اور محبت و قربانی اُن کا عمومی شعار ہو، اسلامی اخوت کے یہ سب حق شناس اور (رحماء بینھم) کے نمونے ہوں، اللہ کے دوستوں کے دلی دوست اور دشمنانِ خدا کے دلی دشمن ہوں، اللہ ورسولؐ کی محبت ان کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو، اللہ ورسولؐ کے لئے اور اُنکے حکموں کی تابعداری میں وہ سب کچھ چھوڑ دینے پر آمادہ ہوں لیکن کسی کے لئے اللہ ورسولؐ اور اسکے احکام سے انحراف کرنا ان کے لئے موت سے زیادہ گراں ہو ——— جبتک مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر دینی وایمانی انقلاب نہ ہوگا مسلمان قوم کا پلہ دنیا میں بھی اتنا ہی ہلکا رہے گا جتنا کہ آج ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے دشمنوں اور بدخواہوں کے مقابلے میں اس کی کوئی فیصلہ کُن مدد نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُس قوم کی حالت بدلتا ہے جو خود اپنی حالت بدلے۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

طریقۂ کار:-

آج کل کسی تحریک اور کسی پیغام کو پھیلانے اور لوگوں میں اچھا یا برا کوئی انقلاب برپا کرنے کے لئے صرف پروپیگنڈہ کو سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اوّل و آخر لٹریچر کی اشاعت ہی پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور جہاں تک عام تحریکات کا تعلق ہو ان کے لئے یہ صحیح بھی ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے کام اور ان کی دعوت کو پھیلانے اور لوگوں میں منشاء نبوت کے مطابق وہ صالح انقلاب پیدا کرنے کے لئے (جو ہماری اس دعوت کا مقصد در پیش نہاد ہے) صرف تقریریں اور مضامین یا تصانیف کی اشاعت پر قناعت صحیح نہیں، ایسا انقلاب جو ذہن و فہم کا انقلاب ہو، دل و دماغ کا انقلاب ہو، پورے طرزِ زندگی کا انقلاب ہو حتیٰ کہ جذبات میں بھی انقلاب ہو، غرض جسم و روح اور ظاہر و باطن کا ایسا مکمل صالح انقلاب جس کو کہیں جلے تو ازلی

اور بے اعتدالی بھی نہ ہو صرف اسی طریقے سے ہو سکتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تھا۔ اس میں پہلا کام اگرچہ دعوت و تبلیغ ہی تھا لیکن جو لوگ اس دعوت سے متاثر ہو کر آجاتے تھے پھر ان کی تکمیل، تعلیم و تربیت اور صحبت سے ہوتی تھی اور اس تعلیم و تربیت اور صحبت کا نظام بھی ایسا نہ تھا کہ دنیا سے الگ تھلگ کسی مدرسہ یا کسی خانقاہ کے گوشہ میں بیٹھ کر یکسوئی سے انجام پاتا ہو بلکہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کا طرز کار یہ تھا کہ جو لوگ آپ کے پیغام کو قبول کرتے تھے وہ پہلے ہی دن سے اس دین کے داعی بھی بن جاتے تھے، گویا آپ کی دعوت کو قبول کرنے کے ساتھ ہی ہر صاحب ایمان آپ کے مشن کا شریک اور "رفیق" بن جاتا تھا، پھر اسی ضمن میں اُس کی تعلیم و تربیت اور آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے سابق الایمان صحابہؓ کی مقدس صحبتوں سے استفادہ کی تکمیل ہوتی رہتی تھی، نیز دعوت دینی کے سلسلہ میں روزمرہ جن جن مرحلوں سے گذرنا پڑتا تھا اُن سے اُن کی سیرت اور زیادہ پختہ ہوتی رہتی تھی ——— بہر حال چونکہ ان کی تعلیم و تربیت کی تکمیل سفر و حضر میں صحبت و رفاقت سے اور دینی جدوجہد کے ضمن میں عملی تجربوں سے ہوتی تھی اس لئے اُن میں تبدیلی صرف ذہنی اور ظاہری یا وقتی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ ان کی پوری سیرت بدل جاتی تھی اور ان کی زندگی ہی کا رُخ پلٹ جاتا تھا۔ غرض اس کامل ہمہ گیر تغیر اور کلی عمومی انقلاب کی طاقت صرف صحبتی[1] اور عملی تعلیم و تربیت ہی میں ہے۔

---

[1] بہت سے ناواقف سمجھتے ہیں کہ اچھی صحبت کی تاثیر کی وجہ یہی ہے کہ صالحین کے ساتھ رہنے میں اُن کی نصائح سننے کا موقع زیادہ ملتا ہے، حالانکہ صحبت کی تاثیر کا اصل راز اس کے علاوہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز میں قرب و اختلاط سے اثر لینے اور خواص و کیفیات کو جذب کرنے کی (بقیہ صفحہ ۲۵ پر)

جس دینی تحریک اور دینی اصلاح کی جس جدوجہد کے متعلق یہ مقالہ لکھا جا رہا ہے۔ اس کا تفصیلی نظام عمل تو پہلے بعض مقالات[1] میں لکھا جا چکا ہے، ناظرین اس کو وہیں دیکھیں یہاں طریقہ کار

---

[1] (۱) نصرت دین و اصلاح مسلمین کی ایک کوشش۔ (۲) مسلمانانِ عالم کی کمزوری کا بنیادی سبب اور طریق علاج۔

(صفحہ ۲۴ کا بقیہ) ایک خاص استعداد اور صلاحیت رکھی ہے۔ کیسی ہی ٹھنڈی چیز آگ کے پاس رکھ دیجئے وہ گرم ہو جائیگی۔ گرم دودھ ایک گلاس میں کر کے برف میں رکھ دیجئے وہ ٹھنڈا ہو جائے گا بلکہ کچھ دیر میں برف ہی کی طرح جم بھی جائے گا، پانی میں یا سادہ بے خوشبو تیل میں گلاب یا چمیلی کے پھول ڈال دیجئے، اس پانی یا تیل میں ان پھولوں ہی کی خوشبو بس جائیگی۔ شیراز کے حکیم نے صحبت کی اسی تاثیر کو بڑی اچھی تمثیل سے سمجھایا ہے۔ ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے | رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری | کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گل ناچیز بودم | ولے یک مدتے با گل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد | وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(گلستان سعدی)

الغرض اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے قلوب میں بھی یہ صلاحیت و استعداد رکھی ہے کہ قرب و اختلاط کی صورت میں ایک قلب دوسرے قلب کی کیفیات و جذبات سے بھی اثرات لے لیتا ہے، اور صحبت کی تاثیر کا یہی اصل راز ہے جن قلوب میں صفائی ہوتی ہے وہ اس مخفی تاثیر و تاثر اور فعل و انفعال کو پوری وضاحت اور تفصیل سے محسوس کر لیتے ہیں اور جن کے دل زنگ آلود اور غفلت یا مادیت کے گرد و غبار کے نیچے دبے ہوتے ہیں وہ اگرچہ وضاحت کیساتھ دل سے دل کے اثر لینے کو محسوس نہیں کرتے لیکن ایک اجمالی تغیر اور تاثر ان کو بھی محسوس ہو سکتا ہے، بشرطیکہ استعداد بالکل ہی فنا نہ ہو گئی ہو۔

سلسلہ کے بھی صرف چند اصول ذکر کرتے ہیں۔

(الف) اس تحریک میں بطور ایک مسلمہ اور آزمودہ نظریہ کے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ موجودہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد، دین سے دوری اور دینی بے حسی یا دین کی کم قدری کے جس مقام پر پہنچ چکی ہے اُس سے ہٹا کے دین کی اُس سطح پر اُس کو لانا جس پر ایک مسلمان کو ہونا چاہیئے اور کوئی حقیقی دینی انقلاب اُن میں پیدا کرنا اب بغیر اس کے ناممکن ہے کہ کم از کم کچھ دنوں کے لئے ان کے غیر اسلامی یا جامد ماحول اور خالص مادی مشاغل سے ان کو نکال کر کسی متحرک اور موثر و متعدی دینی ماحول میں لایا جائے ـــــــ جس ماحول میں دین کا اتنا تنزل ہو چکا ہے اور دینی احساسات اتنے مردہ ہو چکے ہیں، اور جن مشاغل نے دین سے اس قدر غافل کیا ہے اُن میں گھرے رہتے ہوئے صرف وعظوں کے سننے یا دینی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے کسی شخص کا پوری طرح سدھر جانا اور اس کی زندگی میں دینی انقلاب آ جانا انسانوں کی عام فطرت اور عادت کے خلاف ہے، اس لئے اس تحریک میں سب سے زیادہ اور اس پر زور دیا جاتا ہے کہ لوگ اپنے ماحول اور مشاغل سے کچھ دنوں کے لئے جدائی اختیار کر کے اپنی دینی اصلاح و ترقی اور دینی تعلیم و تربیت کے لئے اور ساتھ ہی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جماعتیں بنا بنا کر نکلیں، اور ان جماعتوں کا نظام عمل ایسا بنایا جائے جس میں ہر صلاحیت اور ہر طبقے کے لوگوں کی ظاہری و باطنی دینی اصلاح و ترقی اور تعلیم و تربیت کی تکمیل اور دینی جذبات کی پیدائش و پرورش کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہو۔ گویا یہ جماعتیں چلتی پھرتی درسگاہیں ہوں، متحرک خانقاہیں ہوں، اسلامی اخلاق و معاملات اور اسلامی

اصولِ معاشرت کی عملی تربیت گاہیں ہوں، جہاں دین کی باتیں صرف بتلائی اور سمجھائی ہی نہ جائیں بلکہ حتی الامکان پورے نظامِ دینی کو عمل اور برتاوے سے سیکھا اور سکھایا جائے اور اس طرح اس متحرک دینی ماحول میں رہ کر اپنی پوری زندگی کو متحرک اسلامی زندگی بنانے کی کوشش کی جائے ـــــــ مثلاً رفقائے جماعت میں سے جو علمِ دین میں اپنے سے برتر ہوں اُن سے علم حاصل کیا جائے، جو ذاکر و شاغل اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کی یاد کرنے والے اور اس کے سامنے رونے والے ہوں اُنکی صحبت سے اُن کی یہی خوبی حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، جن کو دین کی باتیں کرنے کا اچھا سلیقہ ہو اُن سے یہ سلیقہ سیکھا جائے، جن میں چُستی، جفاکشی، اور دوسروں کی خدمت گزاری کی جیسی عادات ہوں اُن سے اس کا سبق لیا جائے۔ ہر ایمان والے کیساتھ تواضع و انکسار، بڑوں کی عظمت، چھوٹوں پر شفقت، اور کمزوروں اور ضعیفوں کی خدمت جیسے اخلاقِ حسنہ کی جماعت میں رہ کر مشق کی جائے، مختلف طبقات میں دین کی دعوت اور تبلیغ کا طریقہ سیکھا جائے، اور اس راہ کے نئے نئے تجربوں سے دینی تربیت کی جائے ـــــــ محض اعلاءِ کلمۃ اللہ اور دین کی سرسبزی کے لئے اپنے گھر، اپنے مشاغلِ معاش، اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر نکلنے، راہِ خدا میں محنتیں اور مشقتیں اٹھانے، چین و آرام قربان کرنے، در در پھرنے اور شہروں اور دیہاتوں کی خاک چھاننے اور اپنی گاڑھی کمائی سے ہی اپنا سفر خرچ اٹھانے کی چھوٹی ہوئی اسلامی عادتوں کو پھر سے اس طرح اپنے اندر پیدا کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے نکلنے والی کسی جماعت کے ساتھ رہ کر جس سے ہو سکے

اپنے ماحول ہی میں جماعتیں بنا بنا کر تبلیغ و دعوت کے واسطے پھرنے اور دینی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لئے کہا جائے اور اس کا طریقہ ان کو بتلایا جائے ــــ اگر وہ اتنا کرنے لگے تو انشاء اللہ چند ہی روز کے بعد باہر نکلنے کی بھی توفیق اُنکو ملیگی۔

(ج) جو لوگ مقامی تبلیغ کے کام کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں حکمت کے ساتھ اُن پر تبلیغی کوشش جاری رکھی جائے اور وقتاً فوقتاً جماعتیں اُن کے پاس پہنچکر ان میں دین کی طلب اور دینی تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔

(د) طریقۂ کار ہی کے سلسلہ میں ایک خاص اصول جو اگرچہ منفی ہی مگر نہایت اہم ہے، یہ ہے کہ اس تحریک کا کوئی "باقاعدہ" نظام نہیں ہے جس طرح کہ آج کل عموماً "انجمنوں، جماعتوں، اور کمیٹیوں" کا ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ممبران اور ارکان ہوتے ہیں، کچھ عہدے دار ہوتے ہیں، کوئی صدر، یا ڈکٹیٹر ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ ـــــــ یہ تحریک انجمن سازی اور جماعت بازی کے اُن تمام مروجہ بکھیڑوں کے بغیر محض دعوت اور ترغیب و ترہیب کی اساس پر چل رہی ہے جس طرح قرنِ اول میں مسلمانوں کا طریقۂ کار تھا گویا اپنی اصلاح و تربیت اور دینی انقلاب کی اس جدوجہد میں کام کرنے اور حصّہ لینے کے لئے ہر مسلمان سے اسی طرح اور اسی حق کی بنیاد پر کہا جاتا ہے جس طرح اور جس حق کی بنیاد پر مثلاً اُس سے نماز روزہ وغیرہ کو کہا جاتا ہے۔ بہرحال یہاں کوئی "انجمن" یا "جماعت" یا "حلقہ" نہیں ہے جس کا رکن یا ممبر بننے کی یا کسی امیر سے بیعت کرنے یا کسی شیخ و مرشد کے مرید ہونے کی دعوت دی جاتی ہو بلکہ صرف اس طرزِ پر زندگی گزارنے اور بحیثیت ایک مسلمان کے اس دینی کام کے کرنے کی دعوت دی جاتی ہے

——— اس زمانہ میں اس تحریک کا یہ خاص امتیاز ہے جس کی غیر معمولی اور دور رس مصلحتوں کا اندازہ خود راقم سطور کو بھی تجربہ سے پہلے نہ تھا۔
ایک مشہور صاحب بصیرت عالم دین اور خادم دین نے اب سے دس گیارہ برس پہلے اس تحریک کے "میوات" میں ایک سرسری نظر ہی سے دیکھ کر اس کے اس اصول کی طاقت اور صحت کو خوب سمجھا تھا اور بالکل صحیح لکھا تھا کہ

"(خدمتِ دین کے لئے) انجمن بازی کی ضرورت نہیں، کوئی علیحدہ نام رکھ کر کام کرنا بجائے مفید ہونے کے مضر ہوتا ہے کیونکہ اس سے غیر شعوری طور پر لوگوں میں یہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام میں نہیں بلکہ فلاں نام کی جماعت میں داخل ہوئے ہیں"

بہرحال اس تحریک کا یہ اصول، ملتِ اسلامیہ کی فطرت کے بالکل مطابق اور اس کے موجودہ مزاج کی نہایت صحیح تشخیص و معرفت پر مبنی ہے، اس اصول ہی نے اس کو بہت سے اندرونی رخنوں اور بیرونی رقابتوں اور فتنوں سے محفوظ کر دیا ہے ——— نیز دینی انقلاب کی یہ جد و جہد اس وقت جس مرحلہ میں ہے، اس مرحلہ میں یہی طرز (یعنی جماعت سازی کے بغیر صرف دعوتِ کار) صحیح اور حکیمانہ طریقِ عمل ہے ——— اس طرح کی دعوت اور اس کی راہ میں اشتراکِ عمل سے خود بخود جو اجتماعیت اور مرکزیت وجود میں آتی ہے، اور "کثرت" میں جو "وحدت" پیدا ہوتی ہے، مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ وہ بنائی ہوئی جماعتوں اور کمیٹیوں کے رابطوں سے کہیں زیادہ مستحکم اور طاقتور ہوتی ہے۔

اس کارِ عظیم کی دینی اہمیت اور عظمت!

اگر آپ نے اس کام کی حقیقت، اس جد و جہد کے مقصد اور اس کے طریقۂ کار کو اچھی طرح سمجھ لیا

تو آپ خود ہی اس کی دینی اہمیت اور عظمت کا اندازہ فرما سکتے ہیں، بہت سے ظاہر بیں تو اس کو بھی رائج الوقت "تحریکوں" میں سے بس ایک تحریک سمجھتے ہوں گے لیکن فی الحقیقت یہ "طریقِ نبوت" کا سلوک بھی ہے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جو کچھ روحانی ترقیاں کیں اور قرب و عظمت کے جن مقامات تک انکی رسائی ہوئی وہ سب اسی راہ سے ہوئی۔ اگر حسنِ توفیق اور کسی بندۂ خدا کی صحبت کی برکت سے اس کام میں کسی کو اخلاص و احسان کی نسبت نصیب ہو جائے تو بلاشبہ نفلی عبادات اور ذکر و مراقبہ سے اس کا درجہ بدرجہا زیادہ ہے، یہ "تقرب بالفرائض" کی راہ ہے اور نفلی عبادات اور ذکر و مراقبہ خود اس کے نظامِ عمل کا ایک جزو ہیں ——— یقیناً عابدوں، زاہدوں کا بھی بڑا مرتبہ اور بڑا درجہ ہے لیکن اس راہ کا سالک، یعنی دین کی سربزی اور مرضیاتِ الٰہیہ کے فروغ کے لئے تکلیفیں اٹھانے والا اور "دینی اصلاح و انقلاب کی جد و جہد" میں اپنے چین و آرام کو قربان کرنے والا شخص، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درد کا شریک اور آپ کے مشن کا رفیق ہے۔

وَفِي ذَالِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ٥

حق تعالیٰ نے ایسے بندوں کو اپنا ناصر و مددگار کہا ہے، یقیناً روحانی ترقی کا یہ سب سے اونچا زینہ ہے!

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا أَنْصَارَ اللّٰهِ ٥

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

تاریخ ترمیم و نظر ثانی
۱۰ جمادی الاول سنہ ۱۳۶۸ھ

حضرت مولانا محمد الیاس رح اور انکی دینی دعوت

(تالیف مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

جدید اڈیشن

یہ کتاب اس دور کے مشہور مصلح اور عارف مولانا محمد الیاس رح کی سوانح حیات ہے جسمیں مولانا کے ذاتی حالات اور سوانح کے علاوہ اُن کی مشہور دینی دعوت کو بھی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو بلاشبہ اس دور کی سب سے بڑی اور گہری دینی تحریک ہے

اس دعوت و تحریک کے پس منظر اسکے بنیادی اصول اور اسکی ارتقائی منزلوں کو جس تحقیق و تنقیح کے ساتھ بہترین علمی اور تصنیفی زبان میں اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ اسکے محترم مؤلف ہی کا خداداد حصہ ہے۔

اس اڈیشن میں تین اضافے نہایت اہم ہیں!

(۱) شروع میں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مفصل اور مبسوط مقدمہ ہے جسمیں کتاب و سنت کی روشنی میں انبیاء علیہم السلام کے اصولِ دعوت کی تشریح کرکے دکھلایا گیا ہے کہ اس دینی تحریک کو اسوۂ انبیاء سے کس درجہ کی مطابقت ہے —— (۲) حضرت مولانا محمد الیاس رح کے نہایت اہم خطوط و مکاتیب کے قریباً ۰۰،۷ اقتباسات۔ یہ خطوط کتاب کی پہلی تیاری کے وقت نہیں مل سکے تھے —— (۳) مولانا مرحوم کے آخری سفر حجاز کی مفصل روداد جو حرمین میں دعوت کا سلسلہ جاری کرنے کے لئے کیا گیا تھا —— ان اضافوں نے کتاب کی قدر و قیمت اور اس کی تاثیر و طاقت میں بہت بڑا اضافہ کر دیا ہے۔ اسکے علاوہ نظر ثانی میں اور بھی ضروری ترمیمیں اور بعض غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ اس مرتبہ کتابت و طباعت خاص اہتمام سے دہلی میں ہوئی ہے —— ہر طرح دیدہ زیب ہے —— (قیمت :- عہ/)

ملنے کا پتہ کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ لکھنؤ